R./No. 2186/57 — Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

ٹیلی فون - ۲۹
قیمت تین پیسے [illegible]
[illegible]

تاریخ اشاعت
[illegible]

جلد ۲۴ شمارہ ۱۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ اپریل ۱۹۶۵ء

اداریہ

ایک سو چار ممبران پارلیمنٹ کی عرضداشت

۱۰ اپریل کے انگریزی اخبار اسٹیٹسمین میں یہ خبر شایع ہوئی ہے کہ ایک سو چار ممبران پارلیمنٹ نے وزیر اعظم کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی ہے اور ان سے یہ اصرار کیا ہے کہ اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، دہلی، پنجاب اور راجستھان میں دستور کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت اردو کو علاقائی زبان اور دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔ یادداشت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان چھ ریاستوں کے علاوہ گجرات، مہاراشٹر، آندھرا، مدراس، میسور، اڑیسہ اور مغربی بنگال میں جہاں کی لسانی اقلیت کی زبان اردو ہے وہاں اردو کی تعلیم کے لیے پوری سہولتیں دی جائیں۔ انھوں نے اعلان کیا ہے کہ اردو اور ہندی میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہے اور ہندی کو آسان اور بول چال کے قریب ہونا چاہیے۔ دستخط کرنے والوں میں مختلف پارٹیوں کے لوگ ہیں اور ہمیں امید ہے کہ اس سے بھی بڑی تعداد میں اور دستخط ہوں گے اور وزیر اعظم ان ممبران کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے اور ان کے مطالبے کی معقولیت کو تسلیم کرتے ہوئے جلد ہی صدر کو مشورہ دیں گے کہ وہ دفعہ ۳۴۷ کے تحت اس سلسلے میں ضروری کارروائی کریں۔

باوثوق ذرایع سے معلوم ہوا ہے کہ اتر پردیش میں بھی ڈیڑھ سو سے زیادہ دوھان سبھا کے ممبران نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ ان کو کاغذات ہندی کے علاوہ اردو میں بھی مہیا کیے جائیں۔

اس قسم کے مطالبے دوسری ریاستوں میں بھی اسمبلی کے ممبران کی طرف سے ہونے چاہئیں اور تمام سکولر پارٹیوں کو اس کی تائید کرنی چاہیے۔ یہ مطالبہ اتنا معقول ہے اور اس سے ملک کی یک جہتی پر اتنا خوشگوار اثر پڑے گا کہ اس کی مخالفت کرنے والوں کو سوائے اس کے کہ ناسمجھ اور نادان کہا جائے اور کیا کہا جائے گا۔ لسانی اقلیتوں کو اس طرح ایسی سہولتیں ملنی چاہئیں کہ کبھی دنیا میں یہ سہولتیں میسر آئیں۔ انھیں اپنی زبان میں ہر منزل پر تعلیم دینا اور سرکاری کاموں میں ان کی سہولت کو مدنظر رکھنا حکومت کا فرض ہے۔ اس لیے فرض سے غفلت برتنا ملک کی ترقی میں روڑے اٹکانا ہے۔ اگر اور ممبران پارلیمنٹ اس مطالبے میں شریک ہو جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ صدر اس سلسلے میں جلد ہی ضروری قدم اٹھائیں گے۔ تمام اردو دوستوں کا فرض ہے کہ اس سلسلے میں سب ممبران پارلیمنٹ پر مسئلے کی اہمیت واضح کریں اور ان کی تائید حاصل کریں۔

شیخ عبداللہ بانی مسلم گرلس کالج کا انتقال

شیخ عبداللہ بانی مسلم گرلس کالج علی گڑھ ۹ اپریل کو اکیانوے سال کی عمر میں اس دنیا سے رحلت کر گئے۔ مرحوم سرسید کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ وہ نہ صرف مسلمانوں کے محسن تھے بلکہ پوری ہندوستانی قوم پر ان کا بڑا احسان ہے۔ انھوں نے مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ناسازگار حالات میں ایک

اس شمارے میں

ایک سو چار ممبران پارلیمنٹ کی عرضداشت — ۱
شیخ عبداللہ بانی مسلم گرلس کالج کا انتقال — ۱
سیر بین — ۲
آل پارٹیز اردو علاقائی و ثانوی سرکاری زبان کمیٹی دہلی — ۲
خبر لکھنؤ میں — ۳ و ۴
کبھی ہم جو قوم تو — ۵
ابہام — ۵
اردو ہال حیدرآباد میں اردو والوں کا اجتماع — ۵
خبر لکھنؤ میں — ۶ و ۷
غالب کا ایک خط — ۹
جگر کی غزلیہ شاعری — ۹
اردو — ۱۰
اردو کو مدھیہ پردیش میں دوسری سرکاری زبان بنایا جائے — ۱۰
اردو کو دہلی کی علاقائی زبان قرار دیا جائے — ۱۱
حلقۂ فکر و نظر میں ڈاکٹر تاج بہادر گوڑ کی تقریر — ۱۱
انتخابی جلسہ انجمن ترقی اردو (شاخ برہانپور) — ۱۱
انجمن اردو کے متعلق میں پروفیسر احتشام حسین کی تقریر — ۱۲
کرپال سنگھ بیدار کو حکومت پنجاب کی ادبی اعزاز — ۱۲
موہن یاور اور عابد پشاوری کو انعامات — ۱۲
شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی میں سجاد ظہیر، مسعود جعفری اور مجروح سلطان پوری کی آمد — ۱۳

اسکول کھلوایا اور بڑی پامردی سے اسے چلایا۔ یہ اسکول رفتہ رفتہ انٹر کالج اور پھر ڈگری کالج بنا اور آج سارے ملک میں اس کی ایک خاص اہمیت ہے۔ شیخ عبداللہ جانتے تھے کہ اگر مسلمان عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوئیں تو ہندوستانی مسلمان کبھی ترقی نہ کر سکیں گے اور ان کے پس ماندہ رہنے سے پورے ملک کی ترقی کی رفتار سست ہو جائے گی۔ وہ پچاس ساٹھ برس برابر خاموشی سے جد و جہد کرتے رہے اور آج ان کی کوششوں کے شاندار نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ مرحوم لڑکیوں کی تعلیم کے علاوہ دوسرے تعلیمی اور تہذیبی مسائل سے بھی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ یونی ورسٹی کی بھی انھوں نے بڑی خدمت کی ہے اور سیاسی مسائل میں بھی وہ قومی نقطۂ نظر سے ہر چیز کو دیکھتے تھے۔ ان کی شاندار خدمات کا سب سے اچھا اعتراف یہ ہوگا کہ لڑکیوں کے لیے عام طور پر تعلیم کے ہر میدان میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم ہوں اور آج کی پر پیچ زندگی میں وہ اپنی تہذیب اور اپنی زبان اور اپنی روایات کے ساتھ جدید دور کی ضروریات کو پہچانیں اور مردوں کے دوش بدوش زندگی کے ہر میدان میں ترقی کریں۔ شیخ صاحب مرحوم کی طرح اپنی خدمت کا دائرہ چن لینا اور اس میں یکسوئی کے ساتھ اور مخالفتوں کی پروا کیے بغیر لگے رہنا بھی ضروری ہے۔

سیر بین

امرت لال ناگر ہندی کے بڑے لیکھک اور افسانہ نگار ہیں۔ ویسے بھی بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ ان کی ملنساری، مشترکہ تہذیب سے ان کی محبت، ان کی آسان اور بامحاورہ زبان، اردو ہندی سے ان کا خلوص، یہ سب لوگوں کو ان کی عزت کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ہمارے دل میں ان کی بڑی عزت ہے لیکن ہمیں یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ انھوں نے اردو کو اتر پردیش میں سرکاری حیثیت سے تسلیم کرنے کی مخالفت کی ہے۔ ہمیں ناگر جی سے تو امید تھی کہ وہ ایک اچھے ادیب کی حیثیت سے ہر زبان اور ادب کی ترقی کے لیے آواز اٹھائیں گے اور چونکہ اردو ہندی سے بہت قریب ہے اور وہ جو ہندی لکھتے ہیں وہ اردو سے بہت دور نہیں ہے اس لیے وہ اردو کی ترقی کے لیے ہر تحریک کی خصوصی حمایت کریں گے۔ مگر ہمارا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ پتہ نہیں کہ ناگر جی نے کیوں اردو کو سرکاری حیثیت سے تسلیم کیے جانے کی مخالفت کی۔ انھیں تو یہ علم ہوگا کہ جس شہر میں وہ رہتے ہیں وہ اردو کا مرکز ہے اور اس میں بہت سے اسکول ایسے ہیں جہاں اردو کی تعلیم کا انتظام باوجود کوشش کے نہیں ہوا۔ انھوں نے اس کے لیے کیا کیا۔ اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا، اردو کے چلن میں سہولتیں پیدا کرنا، اب صرف اردو والوں کا کام نہیں رہا۔ یہ قومی کام ہو گیا ہے۔ کیا ناگر جی اردو کی ترقی نہیں چاہتے اور کیا وہ کوئی ایسی صورت بتا سکتے ہیں کہ سرکاری طور پر اردو کو تسلیم کیے بغیر بے پروا اور کوتاہ بیں افسروں کو سرکاری ہدایات کی پابندی پر مجبور کیا جا سکے۔ اور اگر ناگر جی اس اسکول کے حامی ہیں جو اردو کو علیحدہ زبان ہی نہیں سمجھتا تو ان سے یہ سوال کرنا ہے کہ انھوں نے اسکولوں اور کالجوں میں ہندی کے نصاب میں میر، سودا، نظیر، انیس، غالب، میر امن، نذیر احمد، سرشار، شرر، رسوا کے اقتباسات شامل کرانے کے لیے کوشش کیوں نہیں کی۔

ناگر جی جیسے لوگوں کی اردو کی مخالفت ثابت کرتی ہے کہ ہندی کے کچھ پریمی بعض اوقات نا سمجھی میں کس طرح اردو کی مخالفت کے نام سے دراصل ہندی کو بھی نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے۔ اردو کو نقصان پہنچے گا تو ہندی کی ترقی پر بھی اثر پڑے گا کیوں کہ جس طرح اردو ہندی سے بہت کچھ لے سکتی ہے اسی طرح ہندی کو بھی بہت کچھ اردو سے لینا ہے اور پورے ملک میں وہ اس وقت خوشی سے تسلیم کی جائے گی جب سب زبانوں کے درجے کو تسلیم کرے گی، سب کی ترقی کے لیے دروازہ کھلا رکھے گی اور سب کا اثر قبول کرے گی۔

آل پارٹیز اردو علاقائی و ثانوی سرکاری زبان کمیٹی دلی کے زیر اہتمام اردو کنونشن اور مشاعرہ

دلی میں اردو کو علاقائی اور ثانوی سرکاری زبان تسلیم کرانے کے سلسلے میں ایک آل پارٹیز کمیٹی کا قیام عمل میں آ چکا ہے۔ اس سلسلے میں کمیٹی کی طرف سے وزیر اعظم شاستری جی کو ایک میمورنڈم بھی پیش کیا جا چکا ہے۔ ان دنوں دلی کی مختلف ادبی انجمنیں اور سیاسی جماعتیں اردو تحریک کی حمایت میں جلسے منعقد کر رہی ہیں تاکہ تحریک کو عوامی پیمانے پر مقبول اور مضبوط بنانے کے سلسلے میں دلی کی رائے عامہ کو بیدار کیا جا سکے۔ کمیٹی کی ایگزیکیوٹیو نے فیصلہ کیا ہے کہ ۲۹، ۳۰ مئی ۱۹۶۵ء کو اردو کنونشن اور مشاعرہ منعقد کیا جائے۔ اس کے علاوہ اردو اخبارات اور رسائل کی ایک بڑی نمائش کا پروگرام بھی شامل ہے۔ اس کنونشن اور مشاعرے میں ہندوستان کے مشہور دانشوروں، سیاسی رہنماؤں، ادیبوں اور شاعروں کی شرکت کی توقع ہے۔

(کنوینر)

محمد انصار اللہ نظر

میر لکھنؤ میں

محمد تقی میر کی شخصیت اور ان کی شاعری کا رعب ذہنوں پر کچھ اس طرح مسلط ہے کہ ان سے متعلق واقعات کی تحقیق میں بسا اوقات خاصی دشواری پیش آتی ہے لکھنؤ پہنچنے کے بعد ان کی شاعری میں تیزی اور تڑپ پہلے سے زیادہ ہو گئی لیکن اس کے داخلی اسباب کی طرف کم توجہ کی گئی اس مقالہ کا مقصد ان اسباب کی طرف اشارہ کرنا ہے۔

عہد شاہ عالم میں دلی اور اہل دلی پر جو بُرا وقت پڑ رہا تھا اس کی تفصیل بیان کرنے کی احتیاج نہیں جتنے صاحب استطاعت شخص تھے بیشتر ترک وطن کرکے مختلف مقامات پر جا رہے تھے مگر کتنے ہی ایسے بے سروسامان بھی تھے جنھوں نے مجبوراً صبر کا دامن تھاما وطن میں پڑے مصائب جھیلتے رہے انہی میں ایک محمد تقی میر بھی تھے خود کہتے ہیں:

> ان ایام میں فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سروسامانی سے مجبور تھا۔
>
> (ذکر میر بحوالہ لکھنؤ کا دبستان ص [illegible])

یہ کہنا صحیح نہیں کہ دہلی میں شعر و سخن کی قدر نہیں تھی شاہ عالم اور ان کے ولی عہد ابو النصر معین الدین (جو بادشاہ ہو کر اکبر شاہ ثانی کے لقب سے مشہور ہوئے) نہ صرف شعرا کے قدر داں تھے بلکہ خود بھی شاعر تھے۔ شاعروں کی ناز برداری جس طرح ان بادشاہوں نے کی ہے اس کی مثال کم ملے گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف "داد و تحسین" سے پیٹ نہیں بھرتا کیونکہ دلی کا خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا شعرا ہی نہیں عام رعایا بھی معاشی بدحالی کا شکار تھی سودا نے اپنے ہجویہ قصیدہ تضحیک روزگار میں اس کا اچھا نقشہ پیش کیا ہے۔ ترک وطن کا بڑا سبب یہی تھا اس کے برخلاف فیض آباد لکھنؤ میں دولت کی فراوانی تھی میر کے سفر لکھنؤ کا باعث بھی مسئلہ معاش تھا مولانا محمد حسین آزاد کے الفاظ قابل لحاظ ہیں:

> وہاں تو خود خزانہ سلطنت خالی پڑا تھا اس لیے ۱۱۹۰ھ میں (میر کو) دلی چھوڑنی پڑی لکھنؤ پہنچ کر ایک سرا میں اترے۔
>
> (آب حیات ص [illegible])

سعادت خاں برہان الملک نے سلطنت اودھ کی بنیاد رکھی ان کی حیثیت اگرچہ صوبہ داری کی تھی لیکن انھوں نے فیض آباد کی آرائش اس طرح کی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیض آباد شاہجہاں آباد کی ہمسری کرنے کا ... اودھ کی صوبہ داری اگرچہ موروثی نہ تھی لیکن دلی کی حکومت کی کمزوری نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ عملاً یہ موروثی ہو کر رہ گئی تھی دلی سے رقابت کا جذبہ روز افزوں تھا۔

دہلوی شعرا مثلاً خان آرزو، مرزا سودا، حسرت، ضیا، تقی، انشا، مصحفی وغیرہ یکے بعد دیگرے لکھنؤ منتقل ہوتے گئے اودھ کے حکام نے بھی اس طرف خاص طور پر توجہ کی کہ دہلی کا مشاہیر شعرا ان کے دربار سے وابستہ ہو جائیں تاکہ ان کے دربار کی زینت ہو چنانچہ انھوں نے خود ان شعرا کو دعوت دی مثلاً

> بر وقت بربادی دہلی قدیم کے آرزو لکھنؤ کو حسب طلب نواب سالار جنگ کے چلا گیا اسی شہر میں درمیان ۱۱۶۹ ہجری گیارہ سو انہتر کے رحلت پائی لیکن نواب سالار جنگ نے موافق اس کی وصیت کے جنازہ اس کا دہلی کو روانہ کر دیا تھا چنانچہ وہ دہلی میں مدفون ہوا۔
>
> (طبقات شعرائے ہند ص [illegible])

اسی طرح سودا اور میر وغیرہ بھی امرائے لکھنؤ کی دعوت پر ہی وہاں پہنچے ان مشاہیر کی ہجرت کے ساتھ ساتھ دہلی کے دربار کی رونق کم تر ہوتی جاتی تھی اور لکھنؤ کا دربار سجتا جاتا تھا۔ شعرائے دہلی کو لکھنؤ بلانا بھی اسی جذبۂ رقابت کے سبب معلوم ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ لکھنؤ ہی میں شاہ عالم بادشاہ کے بیٹے شاہزادہ سلیمان شکوہ کا دربار بھی سجتا تھا اور متعدد شعرا ان کے وابستگان دولت میں بھی تھے لیکن نواب وزیر چونکہ عملاً اودھ کے "فرمانروا" تھے اس لیے شعرا کی توجہ نواب وزیر کی طرف بہرحال زیادہ تھی۔ معاشی اعتبار سے بدحال دہلوی شعرا نواب کی خوشنودی کے لیے دہلی کی ہجو بھی کرتے تھے چنانچہ

> افتاب شاہ عالم ... اس کو شعرگوئی کا کمال شوق تھا مرزا رفیع السودا نے اس کی ہجو میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔
>
> (طبقات ص ۱۳۳)

خود میر بھی جب لکھنؤ پہنچے تو انھیں نواب کی مصاحبت میں رہ کر "صید نامے" لکھنے پڑے۔ لکھنؤ اور اہل لکھنؤ کا اقتدار بڑھ رہا تھا دہلی اور لکھنؤ کے مذہبی، معاشرتی اور سیاسی حالات میں نمایاں فرق تھا دونوں مقامات کی پسند و ناپسند میں بھی اختلاف ہونا فطری تھا، لکھنؤ میں شاعری کا بھی ایک انداز رفتہ رفتہ پیدا ہونے لگا تھا لکھنؤ کے شعرا اپنے محاورات اور روزمرہ کو بھی نظم کرنے لگے تھے چنانچہ مرزا علی نقی محشر (متوفی ۱۲۰۸ھ) نے یہاں تک کہا:

> محشر اردو زباں کہ ہم سے کوئی جانے گا — کیا ہوا دلی میں محشر اپنی پیدائش نہیں

اسی عہد میں ایسے شعرا بھی نظر آنے لگے جو اساتذۂ دہلی مثلاً سودا اور میر کے شاعر ہونے کے بھی منکر تھے مثلاً

> حاجی تخلص میر محب علی است وی در سلک ملازمان مرزا محمد تقی خاں ترقی از میرزادہ ہائے مرشد آباد بود انسلاک داشت گویند کہ سودای خام شاعری در دماغ خود چنداں گرم کرد است کہ سرمد شعرا و فصاحت آیا مرزا محمد رفیع سودا و سخن سنج بی نظیر محمد تقی میر را ہنوز ول

(طبع می گفتند و شاعر نمی دانست

(مجموعہ نغز صـ۲۴۴)

دہلوی تذکرہ نویسوں نے ان شعرا کی سخت مذمت کی ہے لیکن ان شعرا کا وجود اس دور کے مذاق شاعری کی غمازی ضرور کرتا ہے اس دور میں شیخ قلندر بخش جرأت اپنے تمام معاصرین سے زیادہ کامیاب معلوم ہوتے ہیں انھوں نے لکھنؤ پہنچ کر لکھنؤ کے مذاق شاعری اور وہاں کے ماحول کو سمجھا اور اسی کے مطابق اپنا طرز اختیار کیا دہلوی تذکرہ نویس حکیم قدرت اللہ قاسم کے یہ الفاظ بہت اہم ہیں کہ۔

بنا بر توغل و مناسبت طبع ریختہ و فنہ گوئی سبقت از شعرای دیار مشرق ربودہ و بہ سبب مشقی حسب رواج آب دیار آنچناں اشعار آبدار از طبع گوہر بارش تراوش میکند کہ سعدہ در فصحای انجا نیست و جمی غفیر از سکنہ لکھنؤ نسبت تلمذ بہ وی دارند و گروہی کثیر وی را در این فن شریف بی مثل و عدیل پندارند

(مجموعہ نغز صـ۱۵۵)

جرأت کو لکھنؤ میں جو قبول عام حاصل ہوا اس کا اعتراف اکثر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے لکھنوی تذکرہ نویس اصغر علی بیگ کا بیان ملاحظہ کیجئے۔

در ہر مجلس و مجمع کہ رونق افزا می شد بہ سبب خوش تقریری او کسی بار سخن نمی یافت و ہرگز بر خاطر بار نمی شد مادام (کذا) کہ زندہ بود مقبول دلہا و عزیز ہمہ بود و صاحب عالم میرزا سلیمان شکوہ بہادر در ہم خلاء ادرا بسیار عزیزی داشتند شاگردان بی شمار بہم رسانید و در ہر مشاعرہ کہ می آمد نصف مشاعرہ بلکہ زیادہ از تلامذہ او می شد

(دستور الفصاحت صـ۹۹)

دلی کے مہاجر شعرا کے سامنے معاش کا مسئلہ بہت اہم تھا سعدی کا یہ مصرع بہت مشہور ہے کہ

چناں قحط سالی شد اندر دمشق — کہ یاراں فراموش کردند عشق

کچھ ایسے ہی حالات ان شعرا کے سامنے بھی تھے شاعری ان کا ذریعہ معاش تھی، ان کو ہر باصلاحیت شاعر سے اندیشہ محسوس ہوتا تھا چنانچہ آپس میں رقابت کا جذبہ بھی بہت پیدا ہو گیا تھا لکھنؤ میں شعرا کی معرکہ آرائیاں تو یادگار روایت بن گئی تھیں ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی حسرت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شاعری کے علاوہ ان کی دولت بھی معاصرین کی نظروں میں کھٹکتی تھی چنانچہ بہ کثرت لوگوں نے ان کی ہجویں لکھی ہیں جن میں سودا نے بھی حصہ لیا خود حسرت نے بھی ایک لکھنوی حکیم کی ہجو لکھی ان امور پر نظر کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انشا، اور مصحفی کے معرکے لکھنؤ کی شاعرانہ زندگی میں کوئی نئی چیز نہیں تھے۔

(لکھنؤ کا دبستان شاعری صـ۳۳)

جعفر علی حسرت، میاں جرأت کے استاد تھے، اس وقت میں یہ عرض کرنے سے قاصر ہوں کہ جرأت نے ان سے اپنا حق شاگردی کس طرح ادا کیا، بہرحال یہ حقیقت مسلّم ہے کہ لکھنؤ کے شاعرانہ ماحول پر جرأت کچھ اس طرح مسلط تھے کہ ہر وارد شاعر کو پہلے ان سے نپٹنا پڑتا تھا چنانچہ مصحفی کے حالات میں ہے کہ۔

در اوایلیکہ وارد لکھنؤ گردید آں وقت دور دورہ میاں جرأت بود و مردم شہر ہمہ سخنش را دل پسند او مشاعرہ الیہ چوں دید کہ کسی ملتفت بحالش نمی شود با جرأت طرح خلاف انداختہ

(دستور الفصاحت صـ۹۴)

مصحفی اور انشا کے معرکے بہ وجوہ بہت مشہور ہیں لیکن مصحفی اور جرأت کے مباحثے بھی قابل ذکر تھے چنانچہ اکثر تذکروں میں اس کا ذکر ہے

مصحفی ۔۔۔ با جرأت و انشا مشاعرات و مطارحات کردہ است۔

(گلشن بے خار صـ۲۴)

مصحفی ۔۔۔۔۔ جرأت اور انشا سے مباحثہ بہت کرتا تھا۔

(طبقات صـ۳۵)

غرض ان حالات میں محمد تقی میر لکھنؤ پہنچے میر کی بے سروسامانی کا جو نقشہ مولانا محمد حسین آزاد نے پیش کیا ہے اس میں کچھ مبالغہ ہو سکتا ہے لیکن اسے بے اصل قرار نہیں دیا جا سکتا البتہ آزاد نے ان کی روانگی کا سال ۱۱۹۰ھ بتایا ہے یہ یقیناً غلط ہے مرزا علی لطف کا بیان ہے:

۱۱۹۰ھ میں بزبانیات عزم اس صاحب لشکر معانی تازہ کے حرکت میں آئے اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے

(گلشن ہند صـ۱۶۱)

یہ خیال کہ میر صاحب از خود لکھنؤ گئے غلط معلوم ہوتا ہے بے سروسامانی ان کے عزم سفر میں حارج تھی البتہ سودا کے انتقال کے بعد نواب آصف الدولہ نے جب زاد سفر بھیجا تو میر صاحب لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے خود کہتے ہیں۔

میری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے ۔۔
۔۔ میری طلبی کے لیے نواب سالار جنگ پسر اسحق خاں مؤتمن الدولہ نے ۔۔۔۔ سرکار سے زاد راہ بھیجا

(باقی صفحہ ۹ پر)

کمار پاشی

کبھی تم جو لوٹو...

کسی دن سمندر سے لوٹو، تو آواز دینا
کہ ہم نے
تمہارے سفر کی کہانی لکھی تھی

وہ شاید ابھی تک رہیں آ کے پہچان لینا
جنھوں نے کبھی پتھروں پر،
کبھی خشک پتوں، کبھی ریت پر
داستانیں لکھی تھیں

یہ سچ ہے کہ ہم تھک چکے تھے
ہمارے دماغوں میں اک ابتری تھی
تمہاری کہانی میں کیا رنگ بھرتے، کہ ہم تھک چکے تھے۔
ہمیں صرف اس کے نہ ہونے کا غم تھا
کہ جو مر چکا تھا

تمہیں موسموں نے جو عریاں کیا
اور تمہیں بے کراں پانیوں کے سفر میں جو دولت ملی
اس کا باعث ہمیں تھے
کسی دن سمندر سے لوٹو، تو آنا
ہمیں آ کے پہچان لینا

چندر پرکاش شاد

ابہام

شب جلتا ہے تو اس دیوار پر اس پیڑ کا
پڑتا ہے عکس
ٹہنیاں، پتے بناتے ہیں عجب شکلیں۔ کہ جیسے
مختلف اقسام کے شہکار ایبسٹریکٹ آرٹ کے
ٹانک کر اس دیوار پر گویا مصور نے ہوں یکجا کر دیئے!

اپنی ہر تخلیق پر حیران و ششدر ہے، کہہ رہا ہو
کوئی ہے!؟
جو ایک بھی تصویر کو سمجھے!!
مجھے سمجھائے اگر!!
مجھ کو سمجھائے اس کو میں یہ تصویروں کی دولت
مفت دوں گا!!"

اردو ہال حیدرآباد میں ادیبوں کا اجتماع

حیدرآباد ۱۰ راپریل۔ انجمن ترقی اردو ہند کی اپیل پر اردو کے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کا ایک جلسہ آج شام اردو ہال میں الحاج مرزا شکور بیگ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مرکزی انجمن کی جانب سے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو کے موقف کو تسلیم کرانے کے لیے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں کی دستخطی ایک یادداشت صدر جمہوریہ ہند کو پیش کی جانے والی ہے۔ اس تعلق سے ہر ریاست میں ایک کنوینر نامزد کیا گیا ہے۔ ریاست آندھرا پردیش کے کنوینر مسٹر مخدوم محی الدین نے اس دستخطی مہم کے تعلق سے تفصیلات پیش کرتے ہوئے کہا کہ انجمن نے یہ طے کیا ہے کہ اردو کے ادیبوں، شاعروں، اور مصنفوں کی طرف سے صدر جمہوریہ سے اپیل کی جائے کہ وہ دفعہ ۳۴۷ کے تحت اپنے اختیارات سے کام لے کر اترپردیش بہار، پنجاب، اور دہلی میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیں اور دوسری ریاستوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی معتد بہ تعداد ہو وہاں اس کی تعلیم کے لیے سہولتیں مہیا کرنے کی ہدایت کریں۔ ادیبوں کے اس اجتماع نے مرکز کی اس اپیل کے مضمون سے اختلاف کیا۔ صدر جلسہ نے کہا کہ اس اپیل میں ریاست آندھرا پردیش کا کوئی تذکرہ نہیں، اس لیے اس اپیل پر دستخط نہیں کی جاسکتی۔ مولوی حبیب الرحمن معتمد انجمن ترقی اردو نے کہا کہ ہماری ریاست میں علاقائی زبان کی حیثیت سے اردو کو تسلیم تو کر لیا گیا ہے لیکن قانونی حیثیت سے بھی اس زبان کو مقام ملنا چاہیے اور یادداشت میں اس بات کا تذکرہ ہونا چاہیے۔ عبدالقادر جیلانی اور جمیل احمد بیگ نے بھی مباحث میں حصہ لیا۔ مسٹر سلیمان اریب مدیر صبا نے کہا کہ مرکزی انجمن شاید آندھرا پردیش میں اردو کے موقف سے واقف نہیں ہے۔ مسٹر اسد کرنولی مدیر یوم نے صدر جمہوریہ کو پیش کی جانے والی یادداشت میں ترمیم پیش کرتے ہوئے ایک جملہ کا اضافہ کیا کہ آندھرا پردیش میں جہاں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کیا گیا ہے قانونی حیثیت دی جائے۔

اس ترمیم کو متفقہ طور پر قبول کر لیا گیا ہے جلسہ نے مرکزی انجمن کو اس ترمیم کو قبول کرنے تک دستخطی مہم ملتوی رکھنے کا مطالبہ کیا۔ اس علاقہ میں جہاں اردو بولنے والوں کی کافی تعداد ہو تعلیمی سہولتیں فراہم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ جلسہ میں تعلیمی سہولتوں کے سلسلہ میں ترمیم کی گنجائش میں اضافہ کرنے کا مشورہ دیا۔ طے کیا گیا کہ مرکزی انجمن کے جواب موصول ہونے کے بعد ایک اور جلسہ منعقد کیا جائے جس میں دستخطی مہم کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ آخر میں حیدرآباد کے شاعر مسٹر حیدر شمسی کے انتقال پر دو منٹ کی خاموشی منائی گئی۔

(سیاست حیدرآباد)

(صفحہ ۵ سے آگے)

مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں میں تو پہلے ہی سے دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہوگیا۔۔۔۔ اول سالار جنگ کے ہاں گیا۔

(ذکر میر بحوالہ لکھنؤ کا دبستان شاعری ص۲۳)

میر صاحب کو نواب وزیر نے مدعو کیا تھا اس کی شہادت احمد علی یکتا کے بیان سے بھی ملتی ہے۔

نواب آصف الدولہ مغفور مرحوم ہم بعد رحلت مرزا، میر را از شاہجہان آباد بتحریر طلب داشتہ بہ منصب عالی ملازم ساخت و از خاطرداری و پاس مشارٌالیہ ہیچ دقیقہ فرو نگذاشت

(دستور الفصاحت ص۱۰۰)

سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں ہوا، میر کی طلبی اس کے بعد ہی ممکن تھی چنانچہ ۱۱۹۷ھ میں آئے۔ میر کے سفر کے متعلق نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی البتہ شاہجہان آباد سے ناکام جانے کا ذکر کیا ہے۔

دیدہ حال بہ شاہجہان آباد آمدہ تتبع نیافتہ ناکام برگشتہ در لکھنؤ سیر نمایند و با یحتاج از سرکار نواب وزیر الممالک بہادری یافت بعد از انجا بسیر ملک عدم شتافت۔

(گلشن بے خار ص۱۹۰)

منشی کریم الدین نے اکثر حالات گلشن بے خار سے ترجمہ کیے ہیں چنانچہ میر کے سلسلہ میں بھی شیفتہ کے ان ہی جملوں کا ترجمہ کردیا۔

ابتدا حال میں درمیان شاہجہان آباد کے آیا ناکام پھر کر لکھنؤ کو چلا گیا سرکار نواب وزیر الممالک میں ملازم ہوا ۱۲۲۵ھ میں اس جہان سے فوت ہوا۔

(طبقات ص۲۱۱)

وزیر الممالک نے میر کو طلب کیا اور رعایت سے پیش آئے اس کا ذکر ایک معاصر تذکرہ نویس کے الفاظ میں اور ملاحظہ کیجیے۔

از چند سال در بلدہ لکھنؤ بہ طلب وزیر الممالک آصف الدولہ رفتہ است و نواب موصوف با او بہ رعایت پیش آمدہ تا حال بخوش تنخواہی در لکھنؤ می گذراند

(تکملۃ الشعرا بحوالہ دستور الفصاحت ص۲۲)

دراصل مرزا محمد رفیع سودا نواب وزیر الممالک آصف الدولہ کے مقرب خاص تھے ان کے انتقال سے لکھنؤ ایک عظیم شاعر سے خالی ہوگیا اس کمی کو میر سے پورا کرنے کی کوشش کی گئی لیکن میر کی طبیعت بہت مختلف تھی۔

مولانا محمد حسین آزاد نے میر کے لکھنؤ پہنچنے سے متعلق ایک حکایت نقل کی ہے۔

(میر صاحب کو) معلوم ہوا کہ آج یہاں ایک جگہ مشاعرہ ہے، رہ نہ سکے اسی وقت غزل لکھی اور مشاعرے میں جاکر شامل ہوئے۔۔۔ جب داخل محفل ہوئے تو۔۔۔ انھیں دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔۔۔ بعض اشخاص نے پوچھا کہ حضور کا وطن کہاں ہے، میر صاحب نے یہ قطعہ فی البدیہہ کہہ کر غزل طرحی میں داخل کیا۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو — ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب — رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے تاراج کردیا — ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سب کو حال معلوم ہوا بہت معذرت کی اور میر صاحب سے عفو تقصیر چاہی۔

(آب حیات ص۲۵۲)

اس واقعہ میں کئی باتیں خلاف قیاس ہیں۔

(۱) میر صاحب نواب وزیر کی طلبی پر آئے تھے ان کا آنا کچھ اچانک نہ تھا، لکھنؤ میں اس کا چرچا عام رہا ہوگا۔

(۲) لکھنؤ والوں کی پوشش اور وضع اگر بدل بھی گئی ہو تو بھی دلی سے مختلف لوگ برابر آتے رہتے تھے میر صاحب کی دہلوی وضع اتنی عجیب نہیں ہو سکتی کہ اہل محفل اسے دیکھ کر ہنس دیتے اور یہ پوچھتے کہ حضور کا وطن کہاں ہے؟

(۳) مشاعرے میں بیشتر لوگ میر صاحب سے واقف تھے لکھنؤ کے اس دور کے اساتذہ میں جرأت، مصحفی، سوز، حسرت، انشا وغیرہ سب میر صاحب کو اچھی طرح پہچانتے تھے ایسی صورت میں انھیں اپنا تعارف کرانے کی ضرورت کا پیش آنا کسی طرح قابل قبول نہیں، تجاہل عارفانہ کی گنجائش بھی نہیں تھی کیونکہ یہ بات ڈھکی چھپی نہ رہی ہوگی کہ میر صاحب نواب وزیر کی طلبی پر آرہے ہیں۔ ان حالات میں آزاد کا وہ لطیفہ بھی کہ میر جب لکھنؤ کے لیے ان کی جیب میں کرایہ کے پورے پیسے بھی نہ تھے خیالی ہی سمجھا جانا چاہیے۔ اسی طرح ان کا یہ بیان بھی غلط ہے کہ رفتہ رفتہ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا کہ میر لکھنؤ آگئے (آب حیات ص۲۵۲) میرا خیال ہے کہ مذکورہ قطعہ میر نے کسی اور موقع پر اہل لکھنؤ کی ناقدری سے عاجز آکر کہا ہوگا، ان ناقدریوں کی کیفیت آگے آئے گی۔ لکھنؤ پہنچنے کے بعد میر کو نواب وزیر کے یہاں حصول ملازمت میں تقریباً ایک ہفتہ لگا اور نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت

فاخرہ دیا اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کر کے تعلیم کی خان ناظر کے سپرد کیا۔

(گلشنِ ہند ص ۱۱)

میر با صلاحیت اور کہنہ مشق استاد تھے، صاحب طرز تھے اور کافی شہرت بھی انھیں حاصل تھی لکھنؤ پہنچنے کے بعد وہاں کے شعرا کو ان کی شاعری سے "اندیشہ" کا لاحق ہونا قدرتی امر تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی مخالفت پر اکثر کمربستہ ہو گئے، میر محبت علی حالی اور ان کے ہمنواؤں نے میر کی شاعرانہ صلاحیتوں سے کھل کر انکار کیا، دہلی میں بھی سودا وغیرہ شعرا سے چشمک تھی لیکن کسی نے ان کے شاعر ہونے پر کبھی شک نہیں کیا تھا، اس انکار کی خبر سے میر کے دل پر جو گزری ہوگی اس کا تصور کیا جا سکتا ہے، میر صاحب دلی کے محاورات پر فخر کرتے تھے اور اپنے اشعار کو سمجھنے کے لیے جامع مسجد کی سیڑھیوں کی بولی کا جاننا ضروری سمجھتے تھے۔ لکھنؤ میں مختصر نے صاف کہہ دیا کہ "اردو زبان" کوئی ہم سے سیکھ جائے، میر کے ذہن کو پریشان کر دینے کے لیے یہ ماحول کافی تھا۔

میر کے خلاف ماحول دربار کے باہر اور دربار کے اندر ہر جگہ معلوم ہوتا ہے، ایک واقعہ سنئے:

> نقل است کہ روزی میر صاحب قصیدہ تازہ گفتہ بہ دربار آوردند نواب وزیر کہ از چاشت فراغت کردہ متوجہ شنیدن شد میر صاحب شروع بخواندن کردند و طول دادند اتفاقاً آں روز ملا محمد مغلی کہ تازہ از ولایت آمدہ و شاعر ہم بودہ برای ملازمت آوردہ می خواست کہ او ہم چیزی در مدح حضور بخواند و بطول قصیدہ میر وقت نگذاشت ملا محمد تنگ آمدہ گفت کہ میر صاحب قصیدہ خوب است اما طولانی اگر دماغ نواب صاحب وفائی کرد کہ می شنید؟ میر بمجرد استماع بیانش از دست انداختہ و منقبض شدہ گفت کہ اگر دماغ نواب وفائی کردہ دماغ من کجا وفا می نماید؟ مطلق پاس حضور نہ نمودہ نواب کہ خود خلق مجسم بودہ استمالہ مزاج میر بکمال مہربانی و منتہا نمودہ بقیہ قصیدہ ہم تمام شنیدہ و خاطر ملا ہیچ نہ کرد۔

(دستور الفصاحت ص ۲۵)

اغلب ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب میر تازہ وارد لکھنؤ تھے نواب وزیر ان کی ہر طرح عزت و پاسداری کرتے تھے لیکن ریشہ دوانیاں شروع ہو چکی تھیں، نواب کے استاد میر محمدی سوز خود بھی محمد تقی میر سے کچھ خوش نہ تھے انھیں میر ہی کی وجہ سے اپنا تخلص بدلنا پڑا تھا خود نواب وزیر کا معاملہ بھی یہ تھا کہ وہ سودا، انشا، اور جرأت کا کلام پسند کرتے تھے، انشا کے یہاں پھر بھی ظرافت تھی لیکن سودا کے انتقال کے بعد جرأت اس عہد کا سب سے زیادہ مقبول شاعر تھا اور جرأت کی معاملہ بندی کو میر صاحب "چوما چاٹی" سے زیادہ نہ سمجھتے تھے اس سلسلہ کا ایک لطیفہ معاصر تذکرہ نویس حکیم قدرت اللہ قاسم نے نقل کیا ہے اس کا اردو ترجمہ منشی کریم الدین نے کیا ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

> ایک روز کا ذکر ہے کہ مجلس شعرا مرزا محمد تقی خاں ترقی تخلص کے گھر میں منعقد ہوئی یہ شاعر (جرأت) بھی بہت سے اپنے شاگردوں کو ہمراہ لے کر شریک محفل ہوا غزلیں پڑھیں اور نہایت مورد تحسین و آفریں خاص و عام کا ایسا ہوا کہ شعر کا سننا مشکل ہو گیا سمجھنا تو کجا اتفاقاً سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر بھی اس مجلس میں حاضر تھے قلندر بخش جرأت نے جرأت کر کے اپنے تئیں میر کے پہلو تک پہنچایا اور داد خواہ اپنے اشعار کا ہوا میر نے دو چار بار خاطر داری کی جب کہ دیکھا کہ سخن اس کا چل نکلا کہا کہ جب کہ تم بدیں جد و کد پوچھتے ہو لاچار کہتا ہوں (میر کا مقولہ بعینہ لفظاً نقل کرتا ہوں وہ یہ ہیں)
> کیفیت اس کی یہ ہے کہ تم شعر تو کہہ نہیں جانتے ہو اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو۔

(طبقات ص ۲۰)

جرأت کے قبول عام کا اور میر کے طنز سے ان کے انداز شاعری کو جتنا تعلق تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے، اس ماحول میں میر کے کلام کی قدر ہوتی بھی تو کیسے، ان کے یہاں نہ معاملہ بندی تھی نہ ایسے عشقیہ مضامین اور نہ یہ ظرافت۔ میر کی طبیعت ایسے مضامین کے لیے مناسب بھی نہ تھی نہ ہو سکتا تھا کہ وہ دربار کا کچھ خیال کرتے اور اپنی طبیعت پر کچھ جبر کر کے اس مخصوص ماحول کے مطابق شعر کہنے کی کوشش کرتے لیکن مخالفتوں نے انھیں اور تحکما مزید

؎ سلسلۃ الذہب مصنفہ حضرت جامی قلمی نوشتہ ۱۲۰۲ھ (مملوکہ قاضی [illegible] علی صاحب رئیس دیوان) کے ترقیمہ کی عبارت یہ ہے:

> تمت تمت الکتاب بعون ملک الوہاب حسب الفرمائش عالی منزلت ستودہ خصلت مشیخت پناہ افضلیت دستگاہ ملا محمد نظر مرغنانے (کذا) بہ ید حقیر الحقیر اضعف العباد محمد مسعود عرف زیکر (کذا) کشمیری ۔۔۔۔۔

اگر یہ ملا محمد وہی ہے جس کا ذکر میر کے سلسلے میں آیا ہے تو اس کی شخصیت اور نواب وزیر کی میر کی قدر افزائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تھا۔ ان کے لہجے میں تیزی، خیالات میں یاسیت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ لکھنؤ کے عام مزاق سے دور ہوتے جا رہے تھے یہاں تک کہ نواب آصف الدولہ کی طبیعت بھی ان کی شاعری سے ہٹ گئی۔ مولانا محمد حسین آزاد کے حوالے سے ایک حکایت بیان کرتا ہوں۔

ایک دن نواب نے بلا بھیجا جب پہنچے تو دیکھا کہ نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں ہاتھ میں چھڑی ہے پانی میں لال سبز مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں آپ تماشا دیکھ رہے ہیں میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میر صاحب کچھ فرمائیے میر صاحب نے غزل سنانی شروع کی نواب صاحب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں سے بھی کھیلتے جاتے تھے میر صاحب چیں بہ جبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے نواب صاحب کہے جاتے تھے کہ ہاں پڑھیے آخر چار شعر پڑھ کر میر صاحب ٹھہر گئے اور بولے کہ پڑھوں کیا آپ مچھلیوں سے کھیلتے ہیں متوجہ ہوں تو پڑھوں نواب صاحب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کرے گا میر صاحب کو یہ بات زیادہ تر ناگوار گذری غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ (آب حیات ص ۲۰۳)

یہ واقعہ محض حکایت نہیں بلکہ اس سے پتا چلتا ہے کہ میر صاحب کا انداز شاعری اب بالکل نامقبول تھا اس کی جگہ ایک مختلف شاعری عام ہو چکی تھی آصف الدولہ کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میر سے جو چار شعر سنے وہ ان کے نزدیک بھی [illegible] نہ تھے۔ اس دور میں اہل لکھنؤ سادگی بیان کی جگہ تشبیہات و استعارات اور تراکیب کا استعمال پسند کرتے تھے، معاملہ خیال اور سیدھے سادے بیان کی جگہ وہ خیال بندی اور معنی آفرینی کی طرف مائل ہوتے تھے [illegible] کے مقابلے میں [illegible] کی جانے لگی تھی۔ عشق کا معیار بھی بدل گیا تھا اب کبھی [illegible] نہیں ہوتا بلکہ اب عورت کے حسن [illegible] محسوس کی جانے لگی تھی۔ میر [illegible] پرانی وضع پر قائم تھے اہل لکھنؤ ان کے کلام [illegible] لے سکتے تھے اس دور میں جرات کا [illegible] تھا میر صاحب [illegible] ہو چکے تھے۔

لکھنؤ کے شاعروں کو میر کی شخصیت سے کچھ کوئی دلچسپی نہ تھی البتہ دلی کے مہاجر شعرا کے لیے دلی کی نسبت میں [illegible] کشش تھی [illegible] کچھ [illegible] جرات، مصحفی، انشا [illegible] سب [illegible] میر صاحب [illegible] شعر پڑھتے تھے میر صاحب [illegible] یہ دن بھی انھیں دیکھنے تھے [illegible] انھیں ان سے لکھنؤ [illegible] جرات [illegible]

[illegible]

لکھنؤ دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس — میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیران کیا

میر کی پریشانی کا تصور کیجیے، لکھنؤ سے دل برداشتہ ہو گئے، حالت یہ ہوئی کہ کوئی بات پوچھنے والا بھی نہ رہ گیا۔ مرزا علی لطف جو میر کے بڑے مداح ہیں کس قدر افسوس کے ساتھ کہتے ہیں:

ناقدر دانی سے اغنیا کی اور نافہمی سے اہل دنیا کی اب تا کار سخن سازی اس درجہ کا سد ہے، وہ ہوائے شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معنی پرداز ہے [illegible] نان شبینہ کا محتاج ہے اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔ (گلشن ہند [illegible])

نان شبینہ سے محتاجی کی صرف یہ صورت ممکن ہے کہ میر کی غیرت دار طبیعت نے نواب وزیر کے یہاں سے تنخواہ لینی پسند نہ کی ہو ورنہ ان کی تنخواہ کم از کم ۱۲۱۵ھ (تالیف گلشن ہند) تک بند نہیں ہوئی تھی۔ میر لکھنؤ میں اگر بری طرح پچھتا رہے تھے یہاں سے کہیں بھی چلے جانا چاہتے تھے، لکھنؤ کے بے دردی و بے حسی کا اس کا حشر بھی مرزا علی لطف کے لفظوں میں سنیے:

جس دیار میں کہ درخواست صاحبان والا شان کی زبان دانان ریختہ کے مقدور ہیں لکھنؤ کوئی تو پہلے [illegible] کے [illegible] تقریب میر کی ہوتی لیکن علت پیری سے [illegible] بے چارے مجہول کے مجہول بنے اور جوانان خوش [illegible] سے وقت [illegible] کے مقبول ہوئے زہے خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے اکثر اہل لکھنؤ پکارتے [illegible] لگے ہیں شاعری کی جو [illegible] خالی ہے (گلشن ہند [illegible])

میر کو اب پچھلے [illegible] دلی کی [illegible] اور تڑپ کہتے

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا — وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

جب وہ اپنے مقبوضے آسے یاد کرتے تو انھیں [illegible] لکھنؤ کو برا بھلا کہتے اور کبھی اپنی [illegible] کا رونا روتے [illegible] رہتے اسی عالم میں زندگی کے باقی دن بھی کاٹنے تھے

آباد اجڑا لکھنؤ چغدوں سے اب ہوا — مشکل ہے اس خرابے میں آدم کی بود و باش

میر صاحب نے دوبارہ دلی جانے کی بھی سوچی لیکن [illegible] بدن میں قوت تھی اور نہ سامان سفر [illegible] حسرت سے کہتے ہیں:

[illegible]

[illegible]

مگر میر صاحب کی یہ آخری تمنا کبھی پوری نہ ہو سکی۔ انھیں پھر دلی جانا نصیب نہ ہوا موت نے ان کی مشکلیں آسان کیں ۱۲۲۵ھ میں [illegible] انتقال ہو گیا۔

[illegible]

غالب کا ایک قطعہ

گذشتہ صدی کے اواسط میں جن بزرگوں کو علم پروری، ادب نوازی، اور سخن دوستی کی بنیاد پر شہرت ملی، ان میں مولانا فضل حق خیرآبادی کا نام سرفہرست ہے۔ یہ ایک لائق باپ کے لائق بیٹے تھے۔ ان کے والد مولانا فضل امام کو معقولات اور منقولات میں کم شہرت نہیں ملی۔ وہ دہلی کے صدر الصدور تھے جن کی سبکدوشی کے بعد صدر الدین آزردہ کو یہ عہدہ ملا۔

مولانا فضل امام کی وفات پر غالب نے فارسی میں قطعۂ تاریخ کہا تھا جو ان کے کلیات فارسی میں بھی موجود ہے۔ کلیات میں جو قطعہ ہے وہ چار اشعار پر مشتمل ہے اور اسی تعداد کا عام طور پر علم بھی ہے۔

یہاں اس قطعہ کی روایت کا ذکر کیا جاتا ہے جو قدیم تر ہے اور جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قطعہ پانچ اشعار پر مشتمل اس روایت سے اختلافِ متن کا بھی علم ہوتا ہے

گلدستۂ نازنینان اور طبقات شعرائے ہند والے مولوی کریم الدین نے پانچ تذکرے قلم بند کیے۔ ان کا تذکرہ فرائد الدھر [اردو] یا تاریخ شعرائے عرب ۱۸۴۷ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔ اس تذکرے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شعرا کا ذکر حروفِ تہجی کے لحاظ سے نہیں بلکہ تاریخی ادوار کے لحاظ سے کیا گیا ہے۔ کریم الدین نے تذکرے کو تیرہ صدیوں میں یا تیرہ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر شاعر کا ذکر متعلقہ صدی میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے تیرھویں صدی والے والے باب میں اپنے معاصر شعرا اور علما، کا ذکر کیا ہے۔ اسی صدی کے ضمن میں مولانا فضل امام کا ذکر بھی آگیا ہے جہاں غالب کا قطعۂ زیر بحث بھی درج ہے۔ کریم الدین کے الفاظ یہ ہیں:

"مولانا فضل امام بڑے فاضل کامل اور محقق مدقق گزرے ہیں۔ ان کی تصانیف انھیں کے نام سے مشہور ہیں چنانچہ ایک حاشیہ میرزاہد رسالہ پر بنام حاشیہ مولوی فضل امام، دوسرا میرزاہد جلالیہ پر بھی اسی نام سے مشہور ہے۔

اول میں وہ صدر الصدور شاہجہاں آباد کے تھے جن کی جائے پر مولوی صدر الدین خان بہادر بفضل و فنون افزوں ہیں۔ ان کے اشعار اور عبارات عربی بہت ہیں اور بڑے فاضل تھے۔ انھوں نے درمیان ۱۲۴۴ ہجری کے وفات پائی جن کی تاریخ میں میرزا نوشہ غالب نے یہ چند شعر لکھے ہیں:

اے دریغا قدوۂ ارباب فضل
کرد سوئے جنت الماویٰ خرام
کار آگاہی زیر کار او فتاد
گشت دار الملک معنی بے نظام[1]
چوں ارادت از پئے کسب شرف
جست سال فوت آں عالی مقام
چہرہ مستی خراشیدم بخست
تا شائے تخرجہ گردد تمام
گفتم اندر سایۂ لطف نبی
باد آرامشگہ فضل امام

۱۲۴۴ء

(ڈاکٹر محمود الٰہی)

[1] یہ شعر کلیات میں نہیں ہے۔

[1] اس تذکرے پر راقم سطور کا ایک طویل تعارفی مضمون اردو ادب علی گڑھ میں جلد شائع ہو رہا ہے۔

جگر کی غزلیہ شاعری

اوپر لکھے عنوان سے جناب ابوالخیات اشرف صاحب کا مضمون نظر سے گذرا۔ تعجب ہے کہ مراسلہ نگار نے اپنی حمایت میں مدیگی رامپور کا حوالہ تو دیا لیکن اسی کا وہ حصہ چھوڑ دیا جس میں مصنف کی خامیاں اجاگر کی گئی تھیں۔ مزید تعجب اس پر ہوا کہ انھوں نے نیاز فتح پوری کی بھی حمایت کی۔

جگر کی تنقیص کرنے والے دراصل آج سے سال پہلے کی اردو قواعد اور لغت کو اپنی مشعل راہ بناتے ہیں۔ قواعد عروض و لغت یہ سب آسمانی کتابیں تو نہیں ہیں۔ یہ زبان و ادب کے مشاہدات کے نتائج ہیں۔ جگر کی اپنی زبان ہے، اس کا اپنا لغت ہے، اس کی اپنی قواعد ہے۔ جب زبان و ادب کے قصر میں کسی ادیب کا دم گھٹنے لگتا ہے تو وہ کسی دیوار کو توڑ کر ایک نئی کھڑکی بنا لیتا ہے۔ جب زبان کے مروجہ ڈھانچے میں کسی ادیب کو مافی الضمیر کے صحیح ترین ابلاغ میں مشکل پیش آتی ہے تو وہ اجتہاد سے کام لیتا ہے۔ زبان کا دستور شریعت کی طرح کی نہیں ہے کہ اس میں بدعت کی گنجائش نہ ہو۔

(دیپال کرشن)

—— x x x ——

"اردو"

(معاصر روزنامہ ہندوستان ٹائمز (انگریزی) نے اپنی ۱۲ر اپریل کی اشاعت میں "اردو" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز اور حقیقت پسندانہ اداریہ قلم بند کیا ہے۔ قارئین "ہماری زبان" کے لیے اس کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ ادارہ)

ہندوستان میں اردو کی طرف سے بے توجہی ان افسوسناک نتائج میں سے ایک ہے جو برصغیر کی تقسیم سے نکلے۔ تاریخی اعتبار سے اردو خالص ہندوستانی زبان ہے اور صحیح معنوں میں اس کی جڑیں برصغیر کے اس حصے میں پیوست ہیں جو تقسیم کے بعد بھی ہندوستان کہا جاتا ہے۔ چند بحث طلب اور بے بنیاد مفروضوں کی بنا پر اکثر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ اردو کی ابتدا پنجاب میں ہوئی۔ اردو کی جنم بھومی دہلی کے آس پاس کا علاقہ ہے جو مغرب میں لاہور تک اور مشرق میں اتر پردیش کے مغربی اضلاع تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمیشہ ادبی اردو تصنیف بھی گئی ہے جو دہلی اور لکھنؤ کی تاریخی راجدھانیوں میں نیز ان کے قرب و جوار میں بولی جاتی تھی۔ تقسیم کا ایک عبرتناک پہلو یہ بھی سامنے آیا ہے کہ اس زبان کو جو کہ ہر اعتبار سے خالصتاً ہندوستانی زبان ہے، سرکاری حیثیت سے محروم کر دیا گیا۔ اور اس زبان کو اپنی افزائش کے لیے برصغیر کے اس حصے میں جگہ ملی جس سے اس کو کوئی علاقائی تعلق نہ تھا۔ مہاتما گاندھی نے بھی اس صورت حال کا اندازہ نہیں کیا تھا۔ گاندھی جی تو اردو اور ہندی کو اس "ہندوستانی" کے دو ادبی روپ سمجھتے تھے جو برصغیر کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ مگر ان کی تمام وہ کاوشیں ناکام ہوئیں جن کے ذریعہ وہ ہندی اور اردو کی امتزاجی شکل "ہندوستانی" کو ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے تھے۔ اس ناکامی کا اندازہ آج سرکاری سطح پر استعمال ہونے والی زبان سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر ملک کی تقسیم نہ ہوتی تو بلاشبہ اردو کا یہ افسوسناک حشر نہ ہوتا۔

سیکولر ہندوستان میں اردو کے مسئلے پر غور کرتے وقت اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہیے کہ اردو شمالی ہند کے بڑے حصے میں بولی جاتی ہے اور اس کے بولنے والوں میں ہر فرقے کے لوگ شامل ہیں۔ یہ کہنا حقیقت سے بہت دور ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔

دہلی، بہار اور یو۔پی کے حالیہ مختلف کنونشنوں میں اس بات کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ اردو کو اس کا جائز سرکاری حق دیا جائے۔ اردو کے مسئلے پر اسی پس منظر میں غور کرنا چاہیے۔ اردو کی اس تحریک کو پرجا سوشلسٹ پارٹی کے اہم لیڈروں اور ملک کے دونوں بڑے فرقوں کے سربرآوردہ دانشوروں اور ادیبوں کی بھرپور تائید اور حمایت حاصل ہے۔ ان کا مطالبہ صرف اتنا ہے کہ اردو کو ان صوبوں میں، جہاں اسے علاقائی زبان کی حیثیت حاصل ہے، دوسری سرکاری زبان تسلیم کیا جائے۔ ان کی یہ مانگ کسی لحاظ سے بھی بے جا نہیں کہی جا سکتی۔ ان علاقوں میں اردو عرصہ دراز تک سرکاری زبان رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج بھی بہت سے سرکاری کاموں میں یہی زبان استعمال ہوتی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ان علاقوں میں عوام سرکاری چھاپ والی ہندی کے مقابلے میں اردو کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لیے ایک سے زیادہ معنوں میں اردو کو سرکاری طور پر تسلیم کرنا دراصل اس حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا جو اب بھی عوام کی پرجوش اور روز افزوں تائید رکھتی ہے۔

اردو کو ۶ ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان بنایا جائے

پارلیمنٹ کے ایک سو چار ممبروں کا مطالبہ

نئی دہلی ۱۶ر اپریل۔ ایک سو چار ممبران پارلیمنٹ نے جو مختلف جماعتوں سے تعلق رکھتے ہیں وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے نام ایک میمورنڈم میں زور دیا ہے کہ اردو کو اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، دہلی، پنجاب اور راجستھان میں ایک علاقائی زبان اور دوسری سرکاری زبان آئین کے آرٹیکل ۳۴۷ کے تحت تسلیم کیا جائے۔ میمورنڈم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے علاوہ ہر ایسے صوبے میں جہاں کوئی لسانی اقلیت اردو کو اپنی مادری زبان بتاتی ہو اردو کو اسی حیثیت سے پڑھانے کی پوری سہولتیں فراہم کی جائیں۔ میمورنڈم میں کہا گیا ہے کہ اردو کا ہندی سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میمورنڈم پر دستخط کرنے والوں نے کہا ہے کہ اگر ہندی کو جلد کامیاب بنانا ہے تو اس کو سہل بنانا ہوگا۔ اردو اس کوشش میں بہترین وسیلہ بن سکتی ہے۔

میمورنڈم میں یاد دلایا گیا ہے کہ آنجہانی صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو بھی عرضداشتیں پیش کر کے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی استدعا کی گئی تھی۔ اگر اردو کو ہمارے مطالبے کے مطابق تسلیم کر لیا جائے تو اردو والوں کے اندیشے اور خوف دور ہو جائیں گے اور اس سے قومی و جذباتی ہم آہنگی کو بڑی تقویت پہنچے گی۔

اس میمورنڈم پر دستخط کرنے والوں میں وجے لکشمی پنڈت، این سی چٹرجی، ڈاکٹر سید محمود، کرنل بشیر حسین زیدی، مسز رینو چکرورتی، پی۔ این سپرو، گیانی گرمکھ سنگھ، برجیشور پرشاد، ہیوی داجی، ارجن اروڑا، رگھوبیر سنگھ، لوک ناتھ مصرا، رام سیوک یادو، انصار ہروانی، بیگم انیس قدوائی، ڈاکٹر گوپال سنگھ، یش پال سنگھ، برہم پرکاش، آئی کے گجرال، رام کرشن راٹھور، ایم۔ ایس۔ اوبرائے، عبدالغنی ڈار، شیام لال صراف، بی۔ پی۔ موریہ، صادق علی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

اردو کو دلّی کی علاقائی زبان قرار دیا جائے

انجمن ترقی اردو (ضلع شاخ بیرون دلی) کا مطالبہ

انجمن کا ایک عام جلسہ چوک سبھاش روڈ (گاندھی نگر) میں منعقد ہوا جس میں کانگریس کمیونسٹ اور دیگر سیاسی و سماجی پارٹیوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت ڈاکٹر ہری کرشن صدر منڈل کانگریس نے کی۔ ایک قرارداد کے ذریعہ انجمن کے جنرل سکریٹری شری نند لال پروانہ نے راشٹرپتی اور پردھان منتری سے درخواست کی کہ وہ اردو کو دلّی کی علاقائی زبان قرار دے کر دلّی کے عوام کے ساتھ انصاف کریں اور مشترکہ تہذیب و تمدن کے خزانہ اردو کو صحیح مقام دیں۔ شری رادھا کرشن (کمیونسٹ کونسلر) شری سی۔ ایل اشوک چیئرمین زونل کمیٹی تعلقات عامہ، شری بی۔ ایل چندن نائب صدر انجمن اور روشن سنگھ گجرال ممبر علاقہ کمیٹی نے اس ریزولیوشن کی تائید میں تقاریر کیں۔ مقامی شعراء نے مشاعرے میں شرکت کی۔

(سکریٹری)

حلقۂ فکر و نظر میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی تقریر

حیدرآباد

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے اردو داں عوام سے اپیل کی ہے کہ آج جب اردو کا موقف سخت نازک ہوگیا ہے اور اردو کے مستقبل کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے وہ ایسے وقت صرف زبانی باتوں سے ہٹ کر عملی طور پر اردو کے تحفظ اور بقا کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ انھوں نے اردو شاعروں اور ادیبوں سے کہا کہ وہ اپنی زیادہ سے زیادہ توجہ اردو زبان کی ترویج و ترقی اور اشاعت پر مرکوز کریں تاکہ اس مقصد کو حاصل کرنے میں آسانی ہو۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ حلقۂ فکر و نظر کے ماہانہ ادبی اجلاس میں صدارتی تقریر کر رہے تھے۔ اس اجلاس میں "آج کا شاعر" کے زیرِ عنوان ممتاز شاعر سلیمان اریب نے اپنا منتخب کلام سنایا۔ رضا الجبار نے اپنا نیا افسانہ "خیالوں کی بگڑ ہر۔۔۔۔۔" پیش کیا اور تاج مہجور اور قدیر زماں نے "اریب کی شاعری اور شخصیت" پر اپنے مضامین پڑھے۔ اریب کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر گوڑ نے کہا کہ ان کی شاعری میں وہ فرسودہ نظریات اور روایات نہیں ہیں جو آج کل عام ہوتے جارہے ہیں۔ اس موقع پر مشہور افسانہ نگار آمنہ ابوالحسن کو ان کے افسانوں کے مجموعے "کہانی" کی اشاعت پر ہدیۂ تہنیت پیش کیا گیا۔ اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر گوڑ نے اردو داں عوام سے اپیل کی کہ وہ اردو تخلیقات خرید کر پڑھیں اور اس طرح اردو کہانی نگاروں اور شاعروں کی ہمت افزائی کریں۔ آپ نے حکومت آندھرا پردیش سے مطالبہ کیا کہ وہ اردو کو قانونی موقف عطا کرنے کے سلسلے میں ضروری قدم اٹھائے۔ اس غرض کے لیے انھوں نے عوام سے کہا کہ وہ اردو کا جائز حق حاصل کرنے اور اپنی زبان کو قانونی موقف دلانے کے لیے انجمن ترقی اردو کے ہاتھ مضبوط کریں۔ آخر میں مختصر سی محفل شعر منعقد ہوئی جس میں خورشید نذیر، ابوالخیر صہبا، قمر ساحری، شمس الدین تاباں، وقار خلیل، جہاندار افسر اور غیاث متین نے کلام سنایا۔ معتمد حلقۂ فکر و نظر کے شکریے پر یہ تقریب اختتام کو پہنچی۔

(مرزا نصیر بیگ معتمد نشر و اشاعت)

انتخابی جلسہ انجمن ترقی اردو (شاخ) برہانپور

۴ر اپریل ۱۹۶۶ء کو شب میں دس بجے جنتا لائبریری کا ہال میں صدر انجمن محترم مولوی ظہور حسین رفیقی جعفری صاحب کی صدارت میں انجمن ہذا کا انتخابی جلسہ ہوا۔ جس میں پہلے اقبال نصیب جوائنٹ سکریٹری نے انجمن کی گذشتہ کارگزاریوں کی مختصر رپورٹ پیش کی۔ بعدازاں متفقہ طور پر مندرجہ ذیل عہدیداران کے انتخاب عمل میں لائے گئے۔

صدر انجمن:۔ شریمان دیوی لال کھنہ جی۔

نائبین صدر:۔ شریمان ڈاکٹر گوردھن رام گپتا صاحب۔
محترم جناب حفظ الرحمٰن صاحب انصاری
میونسپل ممبر

سکریٹری:۔ اقبال نصیب۔ جوائنٹ سکریٹری:۔ حافظ محمد صاحب ادیب۔

مجلس منتظمہ:۔ محترم رفیقی جعفری صاحب۔ محترم مولانا سید عبدالرؤف صاحب، شریمان مرلیشن چندر راجے صاحب محترم ڈاکٹر سید شوکت علی صاحب ایم۔ بی۔ بی۔ ایس محترم حبیب نجے خان صاحب بی۔ اے بی۔ ایڈ محترم مرزا محمود بیگ صاحب ساتر بی۔ اے بی۔ ایڈ۔ محترم ڈاکٹر عبدالرشید صاحب ایم ایس سی۔ جناب حاتم مجوی، جناب شفیق راز، جناب شباب مشیر جناب عزیز صاحب، جناب لچھمن داس صاحب لچھمن، جناب محمد جناب قمر احمد، جناب وقار احمد، جناب وحید نگار، جناب محمد صدر الدین صاحب۔

عہدیداران کے انتخابات کے بعد سکریٹری انجمن ہذا اقبال نصیب نے مدھیہ پردیش ریاستی انجمن کے صدر محترم کوثر چاندپوری صاحب کی ارسال کردہ عرضداشت پیش کی جس پر شاعروں، ادیبوں اور مصنفین سے دستخط لے کر صدر جمہوریہ ہند کی خدمت میں پیش کی جانے والی ہے لہٰذا اراکین انجمن سے اپیل کی گئی کہ وہ اس دستخطی مہم میں حصہ لیں۔ ۲۲ر اپریل تک ریاستی انجمن کی ہدایت

کے مطابق بعد پال روانہ کی جا سکے۔ آخر میں ڈاکٹر گپتا صاحب اور مولانا عبدالرؤف شاہ صاحب نے پُرمغز تقریریں کیں۔ یہ انتخابی جلسہ تقریباً ۲ بجے بحسن و خوبی اختتام پذیر ہوا۔

(اقبال نصیب سکریٹری انجمن ترقی اردو (شاخ) برہان پور (ایم۔ پی)

انجمن اردوئے معلیٰ میں پروفیسر احتشام حسین کی تقریر

انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا سالانہ جلسہ ۱۸ر اپریل کو زیر صدارت پروفیسر آل احمد سرور ہوا۔ سرور صاحب نے پروفیسر احتشام حسین صاحب کا تعارف کرایا۔ انھوں نے کہا کہ احتشام صاحب کا شمار اردو کے چوٹی کے نقادوں میں ہوتا ہے ان کی تنقیدیں بڑی بصیرت افروز اور جامع ہوتی ہیں اور انھوں نے ادب کی افہام و تفہیم میں دوسرے اہم علوم سے بڑی مدد لی ہے سرور صاحب کی تعارفی تقریر کے بعد احتشام صاحب نے ادب میں ابلاغ کے مسئلے پر سیر حاصل تقریر کی انھوں نے کہا کہ ادب کے خالقوں اور ادب کا سنجیدہ مطالعہ کرنے والوں نے اظہار و ابلاغ کے مسئلے پر ہر عہد اور ہر زمانہ میں غور کیا ہے کیوں کہ فن، فنکار اور قاری سے جو مثلث بنتا ہے اس میں اظہار و ابلاغ کی بڑی اہمیت ہے انھوں نے اس سلسلے میں بہت سے ملکی اور غیر ملکی ادیبوں کا حوالہ دیا انھوں نے ادب کو ایک کھنچاؤ (Tension) کی پیداوار بتایا جو ادیب کے دل یا دماغ میں ہیجان پیدا کرتا ہے اور جس ہیجان سے نجات حاصل کرنے کے لیے ادیب اپنے خیال جذبے یا احساس کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن یہ اظہار ابلاغ کے بغیر مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ احتشام صاحب کی تقریر کے بعد سرور صاحب نے احتشام صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ احتشام صاحب نے اظہار و ابلاغ کے مسئلے پر جس تفصیل اور توازن کے ساتھ تقریر کی ہے وہ ان کی بالغ نظری کی دلیل ہے۔ اظہار و ابلاغ کا مسئلہ ہر زمانہ میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور ہر زمانہ اپنے مخصوص حالات اور کیفیات کے زیر اثر ان کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتا ہے یہ کبھی روایت اور بغاوت کی کشمکش کی صورت میں سامنے آتا ہے اور کبھی قدامت اور جدیدیت کی ٹکراؤ کی شکل میں۔ فن کار چونکہ ایک مرتب ذہن رکھتا ہے اس لیے وہ پڑھنے والوں کو مسرت کے ذریعہ سے بصیرت دے کر ان کے ذہن کو وسیع کرتا ہے اس لیے ادب کا علمی مطالعہ ہمارے لیے مفید ہے۔ (نامہ نگار)

کرپال سنگھ بیدار کو حکومت پنجاب کا ادبی اعزاز

پنجاب کے محکمۂ لسانیات نے حسب معمول اس برس بھی اردو، ہندی اور پنجابی کے تین اہل قلم کو ان کی ادبی خدمات پر اعزازات مرحمت فرمائے ہیں۔ اردو ادیبوں میں سے یہ اعزاز پروفیسر کرپال سنگھ بیدار کو دیا گیا ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے محکمۂ مذکور کی طرف سے چنڈی گڑھ میں ایک خاص تقریب منعقد کی گئی جس میں حکومت پنجاب نے پروفیسر بیدار صاحب کو سپاسنامہ، خلعت اور گیارہ سو روپے کا کیسہ زر نذر کیا۔ (سورج تنویر)

موہن یاور اور عابد مناوری کو انعامات

حکومت کشمیر کی کلچرل اکاڈمی کی طرف سے ۱۹۶۴ء میں ایک ادبی مقابلہ ہوا جس میں ۱۹۶۱ء سے لے کر ۱۹۶۳ء تک چھپی ہوئی کتابیں شامل تھیں، موہن یاور کو ان کے افسانوی مجموعے "سیاہ تاج محل" پر ایک ہزار روپیہ نقد انعام اور عابد مناوری کو ان کے شعری مجموعے "بہار غزل" پر سات سو روپے نقد کے انعامات دیے گئے ہیں۔ یہ انعام ۲۹ مارچ ۱۹۶۵ء کو ایک خاص تقریب میں سابق وزیر خزانہ شری ترلوچن دت نے تقسیم کیے۔ (سکریٹری بزم اردو ادب بھدرواہ)

شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی میں

سجاد ظہیر، سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری کی آمد

۴ر مارچ ۱۹۶۵ء کو اردو کے مشہور ادیب جناب سجاد ظہیر صاحب شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی دعوت پر تشریف لائے اور شعبہ کے ریسرچ طلباء کو خطاب کیا۔

۸ر مارچ کو اردو کے مشہور شعراء جناب سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری شعبہ میں تشریف لائے اور اپنی غزلیں اور نظمیں سنائیں اور موجودہ ادبی رجحانات پر اظہار خیال کیا۔

ان دونوں جلسوں میں مہمانوں کا تعارف بیگم محمد حسن انچارج ریسرچ اسکیم نے کرایا۔

(سکریٹری شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی دلی)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور نذیر حسن پبلشر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا